محمد حنیف ندوی

تاثرات

(۲)

مسئلہ اصلاح نصاب

بالکل یہی صورتِ حال تعلیمِ حدیث کے سلسلہ میں رونما ہے۔ طلبہ صحیحین کے بعض اختلافی مقامات کا مطالعہ تو خوب محنت اور کاوش سے کرتے ہیں مگر یہ نہیں جان پاتے کہ حکمتِ پیغمبر کیا ہے آنحضرتؐ نے اخلاق و آداب کی شائستگی کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا ہے اور کن بلند مضمونوں کو پیش کیا ہے اجتماعی اہمیت کی احادیث کون کون ہیں اور ایسی احادیث کہاں کہاں اور کس مقدار میں پائی جاتی ہیں جن سے کہ ملت کی تعمیر نو کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح متعلقاتِ حدیث کے بارے میں آج جو مسئلہ شدید اہمیت کا حامل ہے اور جس سے ہمارے طلبا اور اساتذہ حد درجہ کی بیگانگی برت رہے ہیں وہ یہ ہے کہ تشریع دین میں حدیث کا درجہ کیا ہے۔ کیا یہ محض اشاعتِ اسلام کی دینی تاریخ سے تعبیر ہے یا اس کی حیثیت بجائے خود اساس دین اور جزو دین کی ہے۔ اس کی تدوین کب ہوئی اور ہمارے آئمہ فقہ نے اسے کس نقطہ نگاہ سے دیکھا اور کس حد تک تشکیل فقہ میں ان پر اعتماد کیا ہے۔ طلبہ کو ان سب باتوں کا تفصیلی علم ہونا چاہیئے اور اساتذہ کو بتانا چاہیئے کہ احادیث کے بارے میں نقطہ نظر کا انحراف کب اور کیوں معرض ظہور میں آیا۔ اور کس طرح اس نے آہستہ آہستہ ایک مستقل مدرسۂ فکر کی صورت اختیار کی۔ اساتذہ کو اس حقیقت کو بھی ذہن نشین کرانا چاہیئے کہ نقد حدیث کے جن نئے پیمانوں کو مستشرقین نے پیش کیا ہے فنی لحاظ سے ان کو ہم کس حد تک قبول کر سکتے ہیں اور کس حد تک قبول کرنا ہمارے لئے مفید یا مضر ہو سکتا ہے۔

ہماری رائے میں احادیث کی تعلیم کو بھی کئی مرحلوں میں تقسیم کر دینا چاہیئے۔ پہلے مرحلہ میں اس کے ضروری متعلقات پر روشنی ڈالی جائے۔ مثلاً بذریعہ تقاریر بتانا چاہیئے کہ اس کی حجیت و استناد کے کیا دلائل ہیں صحابہ و تابعین

کے زمانے میں اس کی تعلیم و تدریس کا کیا عالم رہا ہے یعنی حضرت علیؓ زید بن ثابتؓ ابودرداءؓ ابوہریرہؓ عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ ابن عمر وغیرہم کی مساعی اشاعتِ سنت نے کن کن جلیل القدر تلامذہ کو پیدا کیا اور پھر تابعین اور تبع تابعین کے مدارس نے کن کن محدثین کرام کو جنم دیا۔ اس طرح گویا نشر و اشاعت حدیث کی تمام تاریخی کڑیوں سے طلبہ کو پوری طرح آگاہ رہنا چاہیئے۔

اس مرحلہ میں یہ بتانا چاہیئے کہ ائمہ حدیث کے حالات کیا ہیں، ان کا پایہ علمی اور ان کا زہد و اتقا کس درجے کا ہے اور انہوں نے جمع و تدوین کے سلسلہ میں کن کن صعوبتوں کو برداشت کیا ہے اور کس احتیاط و سلیقے سے گلشنِ سنت کی آبیاری کی ہے۔ اسی ضمن میں طلبہ کو بتانا چاہیئے کہ محدثین نے احادیث کی چھان بین میں کن اصول و شرائط کو ملحوظ رکھا ہے اور کس حد تک مزید تحقیق و تفحص کے دروازوں کو کھلا رہنے دیا ہے۔

دوسرے مرحلے میں اخلاقی و اجتماعی اہمیت کی احادیث کی طرف طلبہ کی توجہ کو خصوصیت سے مائل کرنا چاہیئے اور موجودہ ذوق اور رجحانات کی روشنی میں ان کی تشریح کرنا چاہیئے۔ فقہی اہمیت کی احادیث کو اس انداز سے پڑھانا چاہیئے کہ یہ فقہ کا اصل ماخذ ہیں لہٰذا قیاس و رائے کی تمام تر وسعتوں کو ان کے تابع رہنا چاہیئے۔ تعلیم احادیث کے سلسلہ میں اہم اور نہایت درجہ لائق اعتنا چیز یہ ہے کہ طلبہ میں سنت سے محبت پیدا کی جائے اور اس انداز سے اس فن کے تدریسی مرحلے طے ہوں کہ جس سے عشقِ پیغمبرؐ کے اسباب کو براہ راست بیدار کرنے میں مدد ملے۔

تیسرے مرحلے میں شروح احادیث کے اہم مقامات کے مطالعہ کی طرف طلبہ کو توجہ دلانا چاہیئے اور فتح الباری و عینی کی معرکہ آرا بحثوں سے روشناس کرانا چاہیئے اور اگر ہو سکے تو ترمذی اور موطا کی شرحوں کو بھی مدنظر رکھا جائے۔

فقہ کی تعلیم ہمارے مدارس میں جس طریق سے ہوتی ہے وہ بھی قطعی اطمینان بخش نہیں اس سے طلبہ میں صحیح فقہی صلاحیتیں نہیں ابھر پاتیں۔ ہماری رائے میں اس میں دو طرح کی اصلاحات ہونی چاہئیں۔ ایک تو صرف قدما کی کتابوں کو نصاب میں رکھنا چاہیئے۔ دوسرے تقابلی مطالعے کو اختیار کرنا چاہیئے۔ قدما کی کتابیں پڑھانے سے طلبہ میں وسعتِ نظر اور گہرائی پیدا ہوگی اور یہ معلوم ہوگا کہ انہوں نے استنباطِ مسائل میں کن بنیادوں اور پیمانوں سے کام لیا ہے۔ تقابلی مطالعہ سے تعصب، تنگ نظری اور تقلیدِ جامد کے بادل چھٹیں گے اور طلبہ کے ذہن پر حقیقت

زیادہ تابانی کے ساتھ جلوہ آرا ہو سکے گی۔

فنون کے پھیلے ہوئے دامن کو سمیٹنے کی سخت ضرورت ہے صرف و نحو میں مثلاً جو تنوع ہے اسے بالکل ختم ہونا چاہیئے۔ صرف ایک ایک کتاب اور وہ بھی اردو میں پڑھا لینا کافی ہے پڑھانے کا طریق یہ ہونا چاہیئے۔ کہ طلباء میں بغیر اس کے کہ اعراب و تعلیل کا ہفتوں ملے کیا جائے براہ راست ادبی ذوق پیدا کیا جائے۔ ایک ایک کتاب کی سفارش ہم اس بنا پر کر رہے ہیں کہ اس سے طلبہ فن کی ان ضروری باتوں سے واقف ہو جائیں گے جو ہمارے دینی لٹریچر میں عام طور پر استعمال ہوتے ہیں ورنہ جہاں تک عربیت کا تعلق ہے۔ اس کا صاف ستھرا انداز قطعی صرف و نحو کی ان مروجہ کتابوں کا رہین منت نہیں۔

ادبیاتِ عربی کی تعلیم کے سلسلہ میں یہ اصول مدنظر رہنا چاہیئے کہ بجائے کتابوں کے زیادہ تر توجہ ایسے ماحول کی تخلیق کی طرف منعطف رہنا چاہیئے جو زبان کے بارے میں صحیح معنوں میں ممد و معاون ثابت ہو سکے۔

معقولات کو ہمارے مدارس میں جس انداز سے پڑھایا جاتا ہے وہ اور بھی نامعقول ہے۔ اس سے نہ تو طلبہ میں فلسفے کا صحیح ذوق پیدا ہوتا ہے اور نہ ذہن میں روشنی اور جلا ہی پیدا ہوتی ہے۔ مزید برآں انھیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ جس فلسفہ کی ہم تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس کا مرتب نقشہ کیا ہے یونانیوں نے ہمیں کیا دیا اور ہم نے اس میں کیا کیا اضافے کئے یعنی اس میں ارسطو کا حصہ کتنا ہے اور فارابی ابن سینا اور ابن رشد نے جو موشگافیاں کیں ان کی تفصیلات کیا ہیں۔

اس سے بڑھ کر ستم ظریفی یہ ہے کہ معقولات کے پورے دفتر کو جو کہیں کہیں بے معنی اور قابلِ اعتراض بھی ہے بغیر کسی تنقید کے پڑھایا جاتا ہے حالانکہ ہمارے ہاں اس پر سخت لے دے ہوئی ہے۔ سہروردی ابن تیمیہ غزالی اور ابن حزم کی دقیقہ سنجیاں کسے معلوم نہیں۔ انھوں نے کس انداز سے یونانی قلعوں پر حملے کئے ہیں اور کس منہج سے ان کی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے، یہ چیزیں اہل علم کے حلقوں میں جانی بوجھی ہیں مگر ہمارے نصاب تعلیم میں تنقید کے ان شاہکاروں کا کہیں بھی ذکر نہیں۔ ظاہر ہے جب تک معقولات کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ پڑھایا نہیں جائے گا اور طلبہ کو یہ نہیں بتایا جائے گا کہ فلسفہ و فکر کی ان قدروں میں کہاں کہاں جھول ہے اس وقت تک ان میں فکر و اندیشہ کی غیر معمولی صلاحیتیں بیدار نہیں ہو سکتیں اور قطعی توقع نہیں کی جا سکتی کہ آئندہ

چل کر یہ حضرات نئی نئی راہوں اور منزلوں سے آشنا ہو سکیں گے۔

قدیم فلسفہ پر مشتمل موجودہ عربی کتابیں اس غرض کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ ان میں بنیادی طور پر تین نقص ایسے ہیں جن کی تلافی ہونا چاہیئے۔ ایک تو ان میں مختلف علوم کا تداخل ہے۔ چنانچہ منطق میں فلسفہ کی آمیزش ہے اور فلسفہ کے ڈانڈے طبیعات سے جا ملتے ہیں، حالانکہ طبیعات علم کی ایک الگ شاخ ہے۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ ان کتابوں میں علوم و فنون کے تاریخی ارتقا اور پس منظر کا پتہ نہیں چلتا۔ تیسرا عیب جو سب سے زیادہ تکلیف دہ اور علمی شگفتگی میں حارج ہے وہ ان کی لسانیاتی ساخت ہے۔

اس کا علاج ہمارے نزدیک یہ ہے کہ معقولات پر اردو میں جامع، سہل اور دلچسپ کتابیں لکھوائی جائیں جن میں یہ نقائص نہ ہوں۔ اس کے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو ان علوم کی تعلیم آسان ہو جائے گی، دوسرے طلبہ کے ذہن و فکر کو معقولات سے صحیح معنوں میں استفادے کا موقع ملے گا۔

آخر میں جو چیز ہمیں کہنا ہے وہ یہ ہے کہ زمانے کی تیز رفتاریوں کا ساتھ دیجئے اور اس بات کا اہتمام کیجئے کہ ہمارے علماء جہاں قدیم میں دست رس رکھتے ہوں وہاں جدید کے معاملے میں بھی ان کی معلومات تسلی بخش ہوں اور وہ اس لائق ہوں کہ اس دور کے معاشرے کا پوری جرأت کے ساتھ سامنا کر سکیں۔ انہیں انگریزی تو پڑھنا ہی چاہیئے۔ اگلا قدم یہ ہے کہ انگریزی کے ساتھ ساتھ موجودہ علوم بھی پڑھیں، موجودہ رجحانات کا مطالعہ بھی کریں اور یہ جاننے کی بھی کوشش کریں کہ فکر و عقل کے جدید پیمانوں نے مذہب و معاشرہ کے کن اصولوں کو متاثر کیا ہے۔